Majallah Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 34, Sr.No.91, 2013 pp 05 - 16

مجلہ تحقیق
مجلہ کلیہ علوم شرقیہ
جلد ۳۴، اپریل۔جون ۲۰۱۳ء، شمارہ ۹۱

اردو افسانے پر پاکستانی ثقافتوں کے اثرات

ڈاکٹر ضیاء الحسن☆

Abstract:

Short story is comparatively a new form of writing but its significant is even more than novel. Short stories reflect the culture, traditions and life styles of a particular age. In this article the scholar has analyzed the impact of local Pakistani cultural on Urdu short story writings.

Key Words: Urdu short story, Pakistani culture, impact and analysis.

کسی بھی معاشرے کے تمام تخلیقی افعال، رویے اور اظہار کے تمام پیرایے اس کی تہذیب و ثقافت سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب تہذیبیں بات کرنا چاہتی ہیں تو زبان پیدا ہوتی ہے اور جب تہذیبیں اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار کرنا چاہتی ہیں تو ادب، فنونِ لطیفہ اور علم پیدا ہوتے ہیں۔ ہر سماجی سرگرمی کی طرح ادب بھی اجتماعیت اور کلیت کا پیش کار ہوتا ہے۔ اگرچہ تخلیقی عمل بہ ظاہر انفرادی نظر آتا ہے لیکن علامتی اظہار کی وجہ سے اجتماعیت کا حامل بھی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ استعاراتی عمل کی وجہ سے شاعری ابہام کے پردے میں انسانی جوہر کے پنہاں رازوں کی امین ہوتی ہے لیکن اپنی لفظیات،

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

استعارات اور علائم و رموز میں پوری سماجی روداد بیان کرتی ہے۔ شاعری کی نسبت افسانوی نثر بیانیہ اسلوب کی حامل ہوتی ہے اور اسی باعث اسے سماجی دستاویز کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ فکشن کے سماجی عناصر کی طرف سب سے پہلے ترقی پسندوں نے نگاہ کی۔ اگرچہ افسانہ اپنی اصل میں انسانی باطن سے سروکار رکھتا ہے لیکن یہ انسانی باطن اپنا وجودی اظہار ایک خاص سماجی صورتِ حالات میں کرتا ہے، اس لیے کم کوش قاری اس کی سماجیت کی طرف زیادہ متوجہ رہتا ہے کیوں کہ افسانے کے سماجی عناصر تک رسائی کے لیے نہ کسی خاص ادبی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ زیادہ غور و فکر کی۔ افسانوی نثر کے مطالعے میں انسانی باطن کے مختلف اور متنوع رنگوں کی تلاش کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ سماجی مطالعہ ان رنگوں کی اپنے معروض سے ہم آہنگی تلاش کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ سماجی مطالعہ میں اگرچہ سیاست مذہب، معاش بھی شامل ہیں لیکن ان سے زیادہ اہمیت ان تہذیبی اور ثقافتی عوامل کو حاصل ہوتی ہے جو انسانی شخصیت کی پرورش و پرداخت میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ انسانی شخصیت اس ثقافتی پس منظر میں نشو و نما پاتی ہے جو از بس کہ ناگزیر ہوتا ہے اور جس کے بغیر انسانی باطن کا مطالعہ ممکن نہیں رہتا۔

پاکستانیت، پاکستانی ثقافت اور پاکستانی تہذیب کا سوال اگرچہ ہمارے دانش وروں نے قیامِ پاکستان سے بھی پہلے اُٹھایا تھا لیکن قیامِ پاکستان کے بعد جوں جوں ہماری تاریخ آگے بڑھی یہ سوال سیاست کی بھینٹ چڑھتا گیا۔ ابتداً پاکستان میں شامل مختلف ثقافتوں اور ان کا اظہار کرنے والی زبانوں کو نظر انداز کرنے کی روش اپنائی گئی جس کے خلاف پہلا احتجاج مشرقی پاکستان سے کیا گیا۔ مشرقی پاکستان آبادی کے لحاظ سے مغربی پاکستان کا ہمسر تھا۔ پاکستان کی مقتدرہ نے ناعاقبت اندیشی سے وہاں اردو اور بنگالی کو ایک دوسرے کی حریف زبانوں کی صورت دے دی جس نے آگے چل کر بڑے مسائل کو جنم دیا اور آخرکار پاکستان کی طاقت ور قوتوں کے غیر فطری فیصلوں کے نتیجے میں سقوطِ ڈھاکہ کا المیہ رونما ہوا اور پاکستان آدھا رہ گیا۔ ون یونٹ نے مغربی پاکستانی ثقافتوں کی شناخت کا سوال پیدا کیا جس کے خلاف سب سے زیادہ احتجاج سندھ سے ہوا اور بعض سندھی دانش

وروں کو اس ضمن میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔

ضیاء الحق مارشل لا کے دور میں خاص طور سے اسلام کو پاکستان کی پانچ ہزار سالہ ثقافت کے مقابل حریف کے طور پر کھڑا کرنے کے نتیجے میں کسی کو جواباً اپنا سلسلہ نسب راجا داہر سے قائم کرنا پڑا اور کسی کو کہنا پڑا کہ مَیں پانچ ہزار سال سے پختون، ایک ہزار سال سے مسلمان اور ساٹھ سال سے پاکستانی ہوں۔ ایک سیدھے سادے معاملے میں پیچیدگی اس لیے آئی کہ افغانستان میں امریکی مفادات کو پورا کرنے کے لیے مجاہدین کی ضرورت تھی جو اسلام کے تصور کے بغیر پورا ہونا ممکن نہیں تھی، یہ اور بات کہ مفادات کے حصول کے بعد وہی مجاہدین آج دہشت گرد قرار پائے ہیں۔ ذاتی اور امریکی مفادات پورے کرتے ہوئے ہم نے اپنی اصل کو نظر انداز کیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج علما کرام ہمیں عربی چغہ پہنانے کی فکر میں ہیں۔ ہماری بدقسمتی یہ ہوئی کہ ہمارے عالمِ دین بھی بے شعور ہیں اور ہمیشہ مقتدرہ کے سیاسی مفادات کے مطابق اسلام کو ڈھالتے رہے ہیں۔ ضیاء الحق کو عربی چغوں والا اسلام درکار تھا کیوں کہ جہاد کا تصور قرونِ اولیٰ کے عرب مجاہدین سے جڑا ہوا تھا، اس لیے اسّی کی دہائی میں ایسا ہی اسلام پاکستانیوں کو عطا کیا گیا۔ جب یہ اسلام امریکیوں کے مفادات کے خلاف ہوا تو لبرل ازم اور نیو صوفی ازم کے ساتھ مشرف مارشل لا آ گیا اور آج ہم اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں بچے کھچے پاکستان کا وجود خطرے میں ہے۔ آج پاکستانی ثقافت کا مسئلہ اِتنا سادہ نہیں رہ گیا جتنا ابتدائی سالوں میں تھا کیوں کہ اب اس پر سیاسی، معاشی، علاقائی، نسلی اور لسانی تعصبات کی گرد بیٹھ چکی ہے۔ اس گرد کو صاف کرنے کے لیے جس قدر خلوص، ایمان داری، دیانت داری، حب الوطنی، قوم پرستی اور انسانیت کی ضرورت ہے، وہ پینسٹھ سالہ سیاست ڈکار چکی ہے۔

اس موقع پر خیر پور یونی ورسٹی سندھ نے یہ سوال ادب کے حوالے سے اُٹھایا ہے۔ یہ سوال سیاسی، معاشی یا مذہبی حوالے سے اُٹھایا بھی نہیں جا سکتا کیوں کہ انھی اداروں کے مکروہ جرائم کے نتیجے میں آج ہم اس صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ ان اداروں نے پوری دنیا میں انسانی اقدار کو پامال کیا ہے اور ان حالات کی پیش بینی کی وجہ سے الیگزینڈر سولزے نسٹن نے بجا طور پر ادب کو مستقبل کی

انسانی اقدار کی بحالی کا واحد ذریعہ قرار دیا تھا۔[۱]

اس پیش آگہی سے انسانیت نے تو کچھ زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا لیکن دنیا کو اپنے پنجوں میں جکڑ لینے کے خواہش مند مٹھی بھر انسان نما بھیڑیوں نے اپنے وسائل سے کام لیتے ہوئے غیر ادبی تحقیقی سرگرمیوں کو ادب کے طور پر پیش کیا، جس کی وجہ سے ادب اور غیر ادب کی تمیز باقی نہ رہی۔ انھوں نے صرف یہی نہیں کیا بل کہ تمام اعلیٰ تصورات، خیالات اور اقدارِ حیات کو کلیشے بنا دیا جس کی وجہ سے آج پوری انسانیت تہی دامن نظر آتی ہے اور انسانی مستقبل تاریک۔ یہ نہیں کہ حقیقی ادیبوں نے اپنی تخلیقی سرگرمیاں معطل کر دیں بل کہ یہ کیا گیا کہ انسانوں کی غالب اکثریت تک ایسے ادب کی رسائی کو ناممکن بنا دیا گیا۔ پہلے انھیں ڈائجسٹ، فیشن میگزین اور ٹی وی پروگرام دیے گئے اور آج ڈش انٹینا اور انٹرنیٹ۔ ان تمام وسائل سے حقیقی ادیبوں کو محروم رکھا گیا اور جعلی ادب، مذہب اور ثقافت کو ان کے ذریعے رواج دیا گیا۔

ادب کا بنیادی مسئلہ انسان اور انسانی اقدار ہیں۔ ادب ہزاروں سال سے غیر انسانی رویوں کے خلاف اپنا نقطۂ نظر تسلسل سے پیش کرتا رہا ہے۔ پاکستانی ادب نے بھی اپنا یہ فریضہ مسلسل ادا کیا ہے۔ پاکستانی ادیبوں نے اپنی تحریروں میں جہاں پاکستانی فرد کے باطنی مکاشفات کو اپنا موضوع بنایا ہے وہاں اس فرد کو اس کے اصل ثقافتی پس منظر میں پیش کیا ہے۔ ان ادیبوں نے یہ کام نہ کسی جذباتیت سے انجام دیا ہے اور نہ اسے شعوری عمل بنایا ہے بل کہ فطری انداز میں اسے پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف علاقوں میں تخلیق ہونے والے افسانوں میں ہمیں مختلف ثقافتوں کا اظہار نظر آتا ہے۔ ان ثقافتوں میں بعض افتراقات ہیں تو بعض اشتراکات بھی ہیں۔ یہ ثقافتیں انھی افتراقات و اشتراکات کے ساتھ مل کر ایک مشترک پاکستانی ثقافت کو تشکیل دیتی ہیں جس کا دائرہ دنیا کی کسی بھی ثقافت سے وسیع ہے۔ افسوس یہ ہے کہ بعض سیاسی مفادات نے ان افتراقات کو اختلافات بنا کر پیش کیا ہے لیکن ادیبوں نے ہر قسم کے تعصبات کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف و محض اصل کو پیش نظر رکھا ہے۔

اردو افسانہ ابتدا ہی سے اپنی تہذیب و ثقافت سے منسلک رہا ہے مثلاً پریم چند کے افسانے دیہاتی زندگی کے بیان اور بیدی کے افسانے سکھ ثقافت کے بیان کے ضمن میں مشہور ہیں۔ اسی طرح اردو افسانے کے پاکستانی دور میں احمد ندیم قاسمی کے افسانے دیہاتی زندگی کی پیشکش کے حوالے سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ قاسمی صاحب وادیِ سون سکیسر کے گانو انگہ کے رہنے والے تھے، اس لیے ان کے ابتدائی افسانوں کا سارا ماحول اور ثقافتی حالات پوٹھوہار کے علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں جس میں پہاڑی علاقے کی ساری سنگلاخی صاف محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس علاقائی فرق کے باوجود اس ثقافت میں اجنبیت نہیں ہے۔ اس علاقے کے رہنے والے پاکستان کے دیگر علاقوں میں رہنے والے انسانوں جیسی رسوم و رواج کے پابند ہیں۔ ان کا مزاج اور ذہنی ساکت انھی جیسی ہے۔

''اس شام جب میں سامان باندھ کر تیار ہو بیٹھا اور می میری ہتھیلی پر شکر رکھ کر میری بخیریت واپسی کے لیے آنسوؤں کی سیلن سے ٹھٹھری دعائیں مانگ چکیں تو حویلی کے باہر مجھے گھنگھروؤں کی آواز سنائی دی جس میں ایک گھنٹی کی ٹنٹناہٹ بھی رینگ رہی تھی۔ اچانک ہش ہش کی مسلسل آوازوں سے امی چونک کر بولیں: اونٹ آ گیا میرے لال! اب سامان رکھوا لے تسلی سے اور پھر اللہ کا نام لے کر چل دے۔ دیر ہوگئی تو کل سارا دن سٹیشن پر بیٹھنا پڑے گا۔ گاڑی صبح کی اذان ہوتے ہی نکل جاتی ہے''۔[۲]

اس اقتباس میں ہتھیلی پر شکر رکھ کر واپسی کی دعا مانگنا مختلف ہوسکتا ہے لیکن ایسی ہی کوئی نہ کوئی رسمِ رخصت پاکستان کے مختلف علاقوں کی ثقافتوں میں ہمیں مل جاتی ہے۔ اسی طرح دعا مانگنا، اللہ کا نام لے کر روانہ ہونا یا گاڑی کا صبح کی اذان کے وقت روانہ ہونا..... سب کے سب ثقافتی اظہارات ہیں۔ ان کے پیچھے مذہب ماخذ کے طور پر موجود ضرور ہے لیکن ہم انھیں مذہب قرار نہیں دے سکتے کیوں کہ مذہبی سرگرمیاں خاص طور پر عبادات ایک مختلف عمل ہے اور مخصوص طریقہء کار اور مقام کار کی متقاضی ہوتی ہیں جب کہ ثقافت کا تعلق روزمرہ کی پھیلی ہوئی زندگی سے ہے اور یہ خودکارانہ انداز میں معاشرتی زندگی میں دخیل ہوتی ہے۔ اس طرح کے مذہبی اظہارات کا ثقافت میں دخل فی الاصل

مذہب کی تخلیقی قوت کی نشان دہی کرتا ہے لیکن اصل قوت انجذاب ثقافت میں مضمر ہوتی ہے جو ایسے اظہارات میں ثقافتی معنویت پیدا کر کے ان کی قوت بڑھاتی رہتی ہے۔

اشفاق احمد کے افسانوں میں بھی پنجاب کی ثقافت کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ انھوں نے لاہور کے ثقافتی مزاج کی پیشکش بہت بھرپور انداز میں کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمارے دیہاتی گھرانوں کے اندر کے ماحول کے بیان میں بھی فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اشفاق احمد کے ابتدائی افسانوں میں برصغیر کی مشترکہ ثقافت کے نقوش بھی اپنی انسانی دلکشی کے ساتھ محفوظ ہو گئے ہیں۔ بعد کے دور میں وہ پنجاب کے دیہات کی ثقافتی زندگی کی طرف زیادہ متوجہ رہے۔ ان افسانوں سے بھی صاف پتا چلتا ہے ثقافتی عناصر کے پس منظر میں مذہب اپنی قوت سے کارفرما ہوا ہے لیکن یہاں مذہب کے بعض عناصر ثقافتی معنویت حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کے شاہکار افسانہ گڈریا میں اُنھوں نے داؤ جی کی صورت میں جس کردار کو پیش کیا ہے وہ اس مشترکہ ثقافت کا نادر نمونہ ہے۔ اسی طرح ان کے افسانے ایلوریا کا ایک فلیش بیک حصہ قرآنِ پاک کی گھروں میں تعلیم کی ثقافتی اہمیت کو پیش کرتا ہے۔

''مَیں نے ایک نظر اپنے درخت کو دیکھا۔ کچھ اسی قسم کے نیم کے ایک پیڑ تلے میری نانی محلے کی لڑکیوں کو قرآن اور احوال الآخرت پڑھایا کرتی تھیں۔ لڑکیاں چادروں کی بکلیں مارے، ماتھے تک اوڑھنیاں کھینچے تلاوت کِیا کرتیں، ہم۔ آستینیں چڑھائے اور نیکریں پہنے ان کے قریب سے گذرتے تو وہ ساری کی ساری رحل اپنے آنچل میں چھپا لیتیں'' [۳۶]

ذکاء الرحمٰن کے افسانوں میں جنوبی پنجاب کی ثقافت کی واضح جھلکیاں ملتی ہیں۔ انھوں نے بہاولنگر اور ہارون آباد کے علاقوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ یہ ریاستی علاقے اپنی ایک الگ تہذیبی شناخت رکھتے ہیں۔ یہاں بعض علاقے سرسبز و شاداب ہیں تو بعض علاقے صحرائی اور بنجر بھی ہیں جہاں پینے تک کو پانی میسر نہیں۔ عام آدی غربت کے ساتھ ساتھ زندگی گزارنے کے ناگزیر وسائل تک سے محروم ہے۔ اس معاشی صورتِ حالات نے یہاں کی ثقافت پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ چناں چہ زندگی کی یہ سختی یہاں کے لوگوں کے مزاج اور گفتگو سے صاف جھلکتی ہے۔ لوگوں کا

گالیاں دے کر گفتگو کرنا یا بعض اوقات نارمل گفتگو میں بد دعائیہ کلمات ادا کرنا ان کی بے آس زندگی کی نشاندہی کرتے ہیں۔

''اگلے دن جب چن ڈھوک کے اُفق پر صبح کا تارا نمودار ہوا اور اونٹوں نے چارے کے لیے بلبلانا شروع کر دیا تو وہ اُٹھا اور حسبِ معمول اپنے توڈے کو چرانے باہر نکل گیا۔ رستے میں اسے ڈمرو مل گیا۔ وہ اس کا ہم عمر تھا اور چن ڈھوک کی سب سے زیادہ عنصیلی ماں کا بیٹا تھا۔ وہ بھی اس وقت اپنے دو میمنوں کو چرانے باہر نکلا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر اب تک اس اکیلی کونج کا گھونسلا چھایا ہوا تھا، چناں چہ اس نے چھوٹتے ہی ڈمرو سے کہا: ''اوئے ڈمرو! اوئے ماں کپّی تھیوے، مجھے ایک گھونسلا ملا ہے۔ کسی اکیلی کونج کا گھونسلا''۔[۱۴]

اس مختصر اقتباس میں چن ڈھوک، اونٹ، توڈا، ڈمرو، میمنا، کونج، اور ماں کپّی تھیوے نہ صرف لسانی اظہار ہے بل کہ ایک پوری ثقافتی فضا کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس علاقے کے ذریعہء معاش کے حوالے سے وہاں کی معاشی صورتِ حالات کو پیش کرتا ہے۔ وہاں کے جانوروں، پرندوں، افسانوں اور ان کے رویوں کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ ذکا صاحب کے افسانوں میں ایسے بے شمار مناظر بکھرے پڑے ہیں جن کی وجہ سے اردو زبان کی ایک نئی تہذیب پیدا ہوئی ہے۔ پنجاب کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے ثقافتی اظہارات سے نہ صرف اردو کے لسانی دائرے کو وسیع کیا ہے بل کہ اس کے ثقافتی دائرے کو بھی بڑھایا ہے اور اس زبان کو صحیح معنوں میں باہمی رابطے کی ایک مشترک زبان کی حیثیت دے دی ہے۔ یہ زبان مقامی زبانوں کی حریف نہیں ہے بل کہ انھی کی طاقت سے نشوونما پا کر پھلتی پھولتی ہے۔ اس نے سیاست دانوں کے ادنیٰ مفادات کی آلہء کار بننے کے بجائے وسیع قومی مقاصد کو پورا کیا ہے۔ اگر چہ چاروں صوبوں کے بعض معدودے چند لسانی مفکروں نے اسے حریف سمجھا ہے لیکن پاکستانی ادیبوں نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے ان کے دعوؤں کو باطل ثابت کیا ہے۔

ساٹھ کی دہائی میں انتخاب جالب نے جس لسانی تشکیل کی تحریک آغاز کی، اگر چہ وہ اپنے سبھاؤ

میں بین الاقوامی نوعیت کی تھی لیکن اس کا ایک نقش قومی اہمیت کا حامل بھی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اردو زبان میں پاکستان کے ہر خطے کی ثقافت کے رنگ ان کی زبانوں کے توسط سے شامل کرنے چاہییں۔ یہ نئی تشکیل فی الاصل ابتدائی دکنی اردو کے زیادہ قریب تھی جس میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ دکن کی مقامی زبانوں کا ذخیرۂ الفاظ بھی شامل تھا جس کا بڑا نثری ادبی نمونہ مُلا وجہی کی سب رس تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اردو زبان کو فورٹ ولیم کالج اور انگریزوں کے قائم کردہ اس جیسے دیگر اداروں نے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا اور اردو زبان کو سادگی کے نام پر اس کے تہذیبی و ثقافتی مآخذ سے محروم کر دیا گیا۔ جس طرح ایک زمانے میں عربی و فارسی زبانیں اس خطے کے لوگوں کے لیے قابلِ فہم تھیں اور ان کی اثرات یافتہ اردو زبان قابلِ فہم تھی، اسی طرح آہستہ آہستہ یہ نوتشکیل شدہ زبان بھی پاکستانیوں کے لیے قابلِ فہم ہو جائے گی۔ یہ ایک علمی بحث ہے اور اس کے حق اور مخالفت میں دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن اس مضمون کی حد تک ہمارے پیشِ نظر اس تحریک کے سب سے فعال افسانہ نگار سمیع آہوجا کا تخلیقی کام ہے جس میں انھوں نے اس لسانی تجربے سے خوب کام لیا ہے۔ ان کے افسانوں میں ہمیں بنگالی، پختون، بلوچی، سندھی، سرائیکی اور پنجابی ثقافتوں اور زبانوں کے آثار ایک ملغوبے کی صورت میں ملتے ہیں۔ مَیں نے انھیں ملغوبہ اس لیے کہا ہے کیوں کہ یہ تجربہ آگے نہیں چل سکا اور اپنے خدوخال نمایاں نہیں کر سکا لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مختلف علاقوں میں لکھی جانے والی اردو زبان میں مقامی ثقافتی و لسانی اثرات شامل کرنے کی جرأت پیدا ہوئی اور پاکستان میں لکھی اور بولی جانے والی اردو زبان اپنے ثقافتی و لسانی دائرے بڑھاتی چلی گئی۔ اب ہمیں پنجاب کے مختلف علاقوں میں لکھے ہوئے افسانوں میں ان علاقوں کے اثرات صاف محسوس ہوتے ہیں، اگرچہ ان علاقوں میں اردو میں لکھنے والوں نے انتخاب میں زیادہ ہوش مندی کا ثبوت دیا اور معیار و مقدار دونوں حوالوں سے اپنے تخلیقی شعور کا زیادہ متوازن استعمال کیا ہے۔ یہی صورتِ حالات ہمیں سندھ، بلوچستان اور خیبر پختون خواہ میں تخلیق ہونے والے ادب میں بھی نظر آتی ہے۔ سمیع آہوجا کے افسانے ''بشو نبی مصطفیٰ''، میں بنگالی زبان و ثقافت اور ''واب بند''، ''عطسہ ءگرد'' میں بلوچی زبان

وثقافت کا رنگ نمایاں ہے۔

''تین گائیں اور بھیڑ بکریوں کا بکھرا ہوا ریوڑ، اور اک اُونچے ریتلے ٹیلے پر کالی چادر کی ڈِھیلی ڈھالی بُکّل میں رُوپوش لڑکی لمبی لکڑی پر دونوں ہاتھ جمائے بیٹھی، نظروں کے جال میں گایوں اور اک اک بھیڑ بکری کو جکڑے، دھیمی دھیمی سی رسیلی گُنگُناہٹ، ریگ زار میں مٹکتی ......، سگیں پونز و شنگیں مہپر، چو، دست ءِ نہ ایت زامری ترنجے، باہ او درنگاں آبشاں ......''۵؂

''ہر ضرب پر اُس کے مُنہ سے دُعا میں لتھڑی چیخ۔ کے واب و کے آ گا، بندہ واب و خدا آ گا، لا الہ الا اللہ رسول منی بزگ ءِ پردا مبات''۔۶؂

''مگر پت! یہ تمھارا داماد!!! گے گے کیسے؟''

''بچّی منی، جو شخص کسی کنواری کا نگیز ڈھانپے وہی داماد ہوتا ہے''۔۷؂

یہ محض زبان نہیں ہے بل کہ گیت ہیں جن میں صدیوں کی روح کرلاتی ہے، دعائیں ہیں جن میں محرومیاں اپنا عکس دِکھاتی ہیں یا لوک دانش ہے جو رسوم و رواج اور روایتوں کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ یقیناً اس نے زبان کا دامن بھی وسیع کِیا ہے اور اس کا کچھ حصہ زبان میں اپنی مستقل جگہ بنا لے گا۔

سندھ اور خصوصاً کراچی کے افسانہ نگاروں کے تخلیقی کام میں سندھ کی روح مختلف لفظوں اور رویوں کے ذریعے صورت پذیر ہوئی ہے۔ ہمارے سرزمینِ سندھ سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں کے کام میں کبھی کرداروں اور ان کے مکالموں میں، کبھی مناظر میں اور کبھی فضا اور ماحول کے ذریعے سندھی ثقافت جلوہ گر رہی، کوئی افسانہ نگار ایسا ہو نہیں سکتا جو کسی خاص ماحول میں لکھ رہا ہو اور اس سے اثر پذیر نہ ہو رہا ہو۔ یہ کوئی شعوری رد و قبول کا مرحلہ نہیں ہوتا کہ اسے اختیار کر لیا جائے یا ترک کر دیا جائے بل کہ یہ تخلیقی عمل کا حصہ بن کر خود بخود اپنا اظہار کرتا ہے۔ اسد محمد خان اور حسن منظر کا شمار موجودہ دور کے نمایاں افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے ہاں تہذیبی رنگا رنگی ہے۔ خالص اردو کی تہذیبی فضا کے علاوہ اسد محمد خان نے شیر شاہی دور کی ہند اسلامی ثقافت کی بازیافت بھی کی ہے اور

اس کے ساتھ ساتھ اپنے موجودہ منظر نامے سے بھی تخلیقی سطح پر کسبِ فیض کیا ہے۔ اسی طرح حسن منظر کے ہاں بھی دنیا کے مختلف خطوں جہاں اُنھوں نے زندگی گزاری، کے ثقافتی اظہار کے ساتھ ساتھ سندھ کی ثقافت کا بھی بڑا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ کہیں یہ پس منظر کا کام دیتا ہے، کہیں مجموعی فضا کا حصہ ہے اور کہیں کہیں سطح پر بھی مل جاتا ہے۔

''عورت بال جھٹکے جا رہی تھی اور اس مشقت سے اس کے لفظ ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے۔ گھب را..... نئیں..... دوائی دیں..... گے تیرے کو..... چا پلائیں گے..... ہاں..... پرے سان مت ہو۔ وہ اپنی مصروفیت ختم کر کے بستر کی پائنتی سے سامنے آئی تو سستے صابن کی صاف ستھری خوشبو اس کے ساتھ آئی۔ خوب چمک دار سفید دانت لشکاتی، مسکراتی ہوئی ایک سانولی صحت مند جوان عورت مگیھواڑوں کا گھاگھرا شلوکا پہنے، تولیے سے بال رگڑتی سامنے کرسی پر آ بیٹھی، بولی: کیسا ہے ابی، صئی ہے۔ مَیں نے آہستہ سے کہا: ہاں، بھوکھ لگی ہوئیں گی تیرے کو۔ روٹی مانی بھی کھلائیں گی..... پھکر نئیں کر'' ۸ (جو کہانیاں لکھیں، ص ۶۱۸)

''یہ لوگ گفتگو میں جس طرح سلام کرنے کے عادی ہیں، اس طرح اللہ اور ان شاء اللہ بھی ان کی زبان سے دن رات نکلتا رہتا ہے اور اس پر انھیں کوئی نہیں ٹوکتا۔ ایسے سمے میں اکثر ان کے مسلمان پڑوسی پرسومل کو سمجھا بجھا کر اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ کوئی اسے تعویذ لا کر پہناتا ہے، کوئی پانو کے انگوٹھوں اور کلائیوں پر سیاہ دھاگا باندھتا ہے اور کوئی عورت کسی مزار کا پڑھا ہوا پانی اسے ہزار منتوں سے پلاتی ہے اور پرسومل جو کھانے پینے میں قطعاً ویشنو ہے، اس کے گلاس کا پانی بالآخر پی ہی لیتا ہے'' ۔۹ (رہائی، ص ۴۱)

حسن منظر کے افسانوی اقتباس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ثقافتی اظہار اس قدر طاقت ور ہوتے ہیں کہ مذہب و ملت کے فرق پر بھی غالب آ جاتے ہیں۔ اس ثقافتی رنگ کو سندھ اور بلوچستان میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں آج بھی ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے اور جسے سندھی یا بلوچی ثقافت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنی مذہبی کتابیں بھی سندھی زبان میں پڑھتے ہیں اور روزمرہ

زندگی میں مسلمان سندھیوں کی طرح عمل کرتے ہیں اور انھی کی طرح سندھی رسوم و رواج اور مزاج و عادات میں بندھے ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار ہر طرح کے تعصب سے بالاتر ہو کر صرف ادب ہی کر سکتا ہے اور ہمیں اس سچ سے روشناس کروا سکتا ہے کہ ثقافت اپنی جغرافیائی حدود میں بعض اوقات مذہب پر بھی غالب آ جاتی ہے۔ اس سچ کو ہمارے علما کرام مذہب کی تکذیب سمجھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں مذہب اور ثقافت کی کشمکش نظر آتی ہے۔ ہمارے علما کرام نے غلطی سے مذہب کی طرح ثقافت کو بھی عرب سے مخصوص سمجھ لیا ہے اور عربی ثقافت کو پاکستانی ثقافت بنا دینا چاہتے ہیں لیکن مذہب اور علما کرام کے تمام تر احترام کے باوجود لوگ اپنی ثقافت سے محروم نہیں ہونا چاہتے کیوں کہ اس میں ان کی صدیوں کی روح اپنا رنگ دِکھاتی ہے اور یہ ان کے اجتماعی تجربے اور حافظے کا حاصل ہے۔

ادب اور خصوصاً فکشن کرداروں یا انسانوں کو ان کے ثقافتی ماحول میں دیکھنے اور سمجھنے کی سعی کرتا ہے۔ ادب انسانی باطن کا فطری اظہار ہے اور ثقافت بھی انسانی تجربے کی صداقت کا فطری اظہار ہے۔ اگرچہ یہ سب کچھ شاعری میں بھی دیکھا جا سکتا ہے لیکن شاعری میں اس کا اظہار علامتی و استعاراتی ہوتا ہے، اس لیے اس کی ثقافتی معنویت تک صرف تربیت یافتہ قاری کی رسائی ہی ممکن ہو پاتی ہے لیکن فکشن بیانیہ اظہار کی وجہ سے ہر آدمی کا تجربہ بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ دو صدیوں کے دوران میں شاعری سے زیادہ افسانوی نثر نے قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی ہے۔ اردو افسانے نے بھی اپنی اس ثقافتی ذمہ داری سے پہلو تہی نہیں کی ہے جس کی وجہ سے اردو کا لسانی اور تہذیبی و ثقافتی دائرہ روز بروز بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

☆☆☆☆

حواشی

۱۔ الیگزینڈر سولزے نستن، نوبل خطبہ، ترجمہ: سجاد باقر رضوی، سویرا لاہور، شمارہ نمبر، ص

۲۔ احمد ندیم قاسمی، مجموعہ احمد ندیم قاسمی جلد اوّل، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۸، ص۳۹

۳۔ اشفاق احمد، گڈریا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶، ص:

۴۔ ذکاءُالرحمٰن، ذکاءُالرحمٰن کے افسانے، کلاسیک لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۱۲۵

۵۔ سمیع آہوجا، طلسمِ دہشت، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۱۴

۶۔ سمیع آہوجا، طلسمِ دہشت، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۸۸

۷۔ سمیع آہوجا، طلسمِ دہشت، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۸۹

۸۔ اسد محمد خان، جو کہانیاں لکھیں، اکادمی بازیافت کراچی، ستمبر ۲۰۰۶، ص۶۱۸

۹۔ حسن منظر، رہائی، شہرزاد کراچی، ۲۰۰۸ء، ص۱۴